© rasailojaraid.com

چوتھی قسط:

اجتہاد اور تبدیلئ احکام

مولانا مجیب اللہ ندوی

جامعۃ الرشاد، رشادنگر انڈیا

کتابیہ کیساتھ نکاح کے حکم کی منسوخی:

معلوم نہیں مولانا جعفر صاحب پھلواری نے یہ بات کہاں سے پیدا کرلی کہ قرآن کی اجازت کے باد جود حضرت عمرؓ نے کتابیہ کے ساتھ نکاح کو منسوخ قرار دے دیا اور مسلمانوں کو اس سے روک دیا۔ اولیات عمرؓ میں مولانا جو یہ نیا اضافہ فرمایا ہے اس کا ثبوت کم ازکم راقم کو تو کسی قابل ذکر تذکرہ و تاریخ میں نہیں ملا۔ اسی طرح آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں فرمایا ہے کہ انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ (ثقافت اسلامیہ لاہور، اپریل ۱۹۵۷ء)۔

حضرت عمر اور حضرت علی رضوان اللہ عنہما نے بعض شرعی وجوہ کی بنا پر اس سلسلہ میں کچھ پابندیاں ضرور عائد کیں مگر وہ حکم علی حالہ باقی رہا۔ اس میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ مختصراً اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ سورۃ مائدہ کی ابتدا میں حرام وحلال اشیاء کا تذکرہ کرتے ہوئے اہل کتاب کے بارے میں یہ حکم دیا گیا ہے:

"والمحصنت من الذین اوتو الکتاب من قبلکم اذا اتیتموھن اجورھن محصنین غیر مسافحین ولا متخذی اخدان. (مائدہ۵)"

(مومن عورتوں کے علاوہ) تم اہل کتاب کی پاکباز عورتوں سے بھی نکاح کرسکتے ہو، (مگر شرط یہ ہے کہ)۔ جب تم ان کا مہر ادا کردو اس طرح پر کہ انکو تم بیوی بنا کر رکھو، نہ ان سے علانیہ بدکاری کرو، اور نہ چھپ چھپا کر اس آیت میں مسلمانوں کو اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ پاکباز کتابیہ عورتوں سے کتابیہ رہتے ہوئے بھی وہ نکاح کرسکتے ہیں لیکن یہ اجازت کئی شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ ایک یہ کہ کسی ایسی آسمانی کتاب پر جس کا آسمانی کتاب ہونا ثابت ہو، ایمان رکھتی ہوں، دوسرے یہ کہ یہ نکاح پاکباز عورتوں ہی سے کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ یہ نکاح واقعی نکاح ہو، ظاہری وخفیہ طور پر زنا وبدکاری کا بہانہ یا پیش خیمہ نہ ہو۔ اہل کتاب کا لفظ قرآن پاک میں عام طور پر یہود و نصاریٰ کے لئے استعمال ہوا ہے، لیکن چونکہ قرآن پاک نے لفظ عام "اوتو الکتاب" استعمال کیا ہے اس سے بعض صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین نے ان صابئوں کو بھی اس عموم میں داخل کیا ہے جو یا تو نیم عیسائی تھے اور کچھ سیاسی ومعاشرتی دباؤ کی بناء پر اپنے کو یہودی یا عیسائی کہنے لگے تھے، اس لئے اس کی تعین میں صحابہ کے درمیان تھوڑا سا اختلاف ہوا اور وہ اختلاف صرف یہ ہوا کہ کون کون لوگ اس عمومی حکم میں داخل ہیں اور کون اس سے خارج ہیں، کیا وہ لوگ جو نسلاً تو عرب ہیں مگر انہوں نے معاشی یا سیاسی دباؤ کی بناء پر عیسائیت یا یہودیت قبول کرلی تھی، جیسے بنو تغلب جو تھا عرب قبیلہ مگر عراق کی سرحد پر آباد ہونے اور سیاسی ومعاشی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طور پر رومیوں کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے اس نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔اسی بنا پر حضرت علیؓ اس کے عیسائیوں کو اہل کتاب میں شامل نہیں کرتے تھے، وہ فرماتے تھے کہ ان میں میں شراب نوشی اور سود خوری کے علاوہ کوئی خصوصیت ایسی نہیں ہے جو ان میں اور عیسائیت میں پائی جاتی ہو، اس لیے وہ ان کی عورتوں سے نکاح کرنے سے منع فرماتے تھے، مگر کم از کم ان ہی میں ملے جلے اور ان کے حلیف ہیں۔اس بنا پر یہ بھی ان ہی میں شمار کیے جائیں گے کیونکہ قرآن مجید میں ہے کہ جو ان کے دوست ہیں وہ ان ہی میں ہیں اس لیے ان کی عورتوں سے بھی شادی کی جاسکتی ہے۔

اسی طرح امام ابوحنیفہؒ عراق کے عیسائیوں کو اہل کتاب میں شمار کرتے تھے جنہوں نے ظاہری طور پر عیسائیت قبول کر لی تھی۔مزید تفصیل:

(قرآن صائبین کے نام سے جن لوگوں کو دیا کرتا ہے وہ اصل میں کواکب پرست ہیں۔لیکن جو صابی عراق اور جزیرہ کے قریب آباد تھے انہوں نے قسطنطین یعنی رومیوں کے غلبہ کے بعد مجبوراً عیسائیت قبول کر لی تھی۔ظہور اسلام کے وقت کواکب پرست صابی زیادہ تر حران کے آس پاس آباد تھے تو جو لوگ ان ستارہ پرست صابیوں کو سامنے لکھتے ہیں وہ انکو مشرک قرار دیتے ہیں اور جو انکو عیسائی سمجھتے ہیں وہ انکو اہل کتاب میں شامل کرتے ہیں چونکہ امام صاحب عراق کے رہنے والے تھے اور وہ اسکے پاس ہی آباد تھے اس لیے انہوں نے نہیں اہل کتاب میں شمار کیا ہے)۔

اس تفصیل سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہ اللہ عنہم کے درمیان ان کی تعیین کے بارے میں اختلاف تھا اور اختلاف کی اصل وجہ یہ ہوئی کہ ایک طرف تو قرآن میں مشرک عورتوں سے نکاح حرام اور ممنوع قرار دیا گیا جیسا کہ: ''ولا تنکحوا المشرکات حتی تومن'' اور دوسری طرف اہل کتاب عورتوں سے نکاح جائز قرار دیا گیا حالانکہ ان میں بھی عیسائیوں کے کتنے گروہ ایسے تھے جو اپنے عقیدہ وعمل میں اہل کتاب کے مقابلہ میں اہل شرک سے زیادہ قریب تھے اس لیے ان کو کسی میں شمار کیا جائے، چنانچہ حضرت علیؓ نے اس بنا پر بنو تغلب کی عورتوں نکاح کرنے سے منع فرمایا، کہ ان پر عیسائیت کے بجائے شرک و بت پرستی غالب تھی اور شریعت کا یہ اصول ہے کہ جب تحلیل تحریم دونوں جمع ہو جائیں تو تحریم ہی کو ترجیح دی جائے گی۔حضرت علیؓ کی اس اجتہادی رائے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے اہل کتاب سمجھتے ہوئے بھی کتابی عورتوں سے نکاح ممنوع قرار دے دیا، مگر حضرت عمرؓ کے بارے میں تو یہ بات بھی نہیں ملتی کہ انہوں نے کسی خاص گروہ کو اس سے خارج کیا ہو۔ان کے بارے میں یا تو یہ واقعہ ملتا کہ انہوں نے بنو تغلب کے عیسائیوں کو یہ حکم دیا تھا کہ جو عیسائی مسلمان ہو جائیں اور وہ یتیم بچے اور بچیاں چھوڑ کر مر جائیں تو ان کو عیسائی نہ بنائیں بلکہ انکو مسلمان ہی رہنے دیں کیونکہ جب انکے باپ مسلمان تھے تو انکے بچوں کو مسلمان ہی سمجھا جائے گا۔یہ حکم ان کو اس لیے دینا پڑا کہ بنو تغلب کے عیسائی ان کو بھی عیسائی بنانے کی کوشش کرتے تھے، یا پھر ان کے بارے میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے مدائن میں ایک کتابیہ سے شادی کر لی تھی تو آپ نے انکو حکم دیا کہ وہ طلاق دے دیں مگر اس کا تو ذکر کہیں نہیں ملتا کہ انہوں نے اس بارے میں عام اہل کتاب کے بارے میں یا کسی مخصوص عیسائی یا یہودی کے بارے میں یہ حکم دیا ہو کہ ان سے نکاح نہ کیا جائے یا ان سے نکاح نہ کیا جائے یا ان سے نکاح کرنا ممنوع ہے۔حضرت حذیفہؓ کو انہوں نے اس سے کیوں منع کیا، اس کی تھوڑی سی تفصیل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملاحظہ ہو: حضرت حذیفہؓ مدائن کے امیر تھے انہوں نے وہاں ایک یہودیہ سے شادی کرلی۔ مدائن کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

(مدائن، دجلہ وفرات کے دوآبہ کے درمیان کا ایک حصہ تھا عراق کے دوسرے شہروں کی طرح یہاں بھی یہودی، نصرانی کثرت سے آباد تھے بغداد کی تعمیر سے پہلے اس کی وہی حیثیت تھی جو بعد میں بغداد کی ہوئی۔)

جب حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے ان کو لکھا کہ ''خل سبیلا'' اس کو طلاق دے دو۔ حضرت حذیفہؓ نے لکھا کہ کیا اس سے نکاح کرنا حرام ہے حضرت عمرؓ نے ان کو لکھا کہ:۔

''ولکنی اخاف ان توقعوا لمومسات منھن .(احکام القران جصاص ، ج ۲ ص ۳۲۴)''.

ان سے نکاح کرنا حرام تو نہیں مگر میں ڈرتا ہوں کہ تم اس طرح ان کی بدچلن اور فاحشہ عورتوں پر بھی نہ جا پڑو۔

اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کو حرام وممنوع قرار نہیں دیا تھا بلکہ ان کو اس سے باز رکھنے کا اصل سبب یہ تھا کہ یہ چیز زنا کاری اور بدچلنی کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ حضرت عمرؓ کے اس حکم کے سمجھنے کے لئے اس وقت عراق ومدائن کی اخلاقی حالت سے واقفیت کی بھی ضرورت ہے۔ اس علاقہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کی اکثریت تھی اور دونوں فرقوں کی اخلاقی حالت انتہائی زبوں تھی۔ خاص طور پر یہودی عورتیں تو اپنی بدچلنی میں ہر جگہ مشہور تھیں حضرت حذیفہؓ ایک ممتاز صحابی اور وہاں کے امیر تھے، اس لیے آپ انہیں اس سے روکا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا یہ طرز عمل وہاں کے عام مسلمانوں کیلئے، جن میں اکثریت نومسلموں کی تھی، کسی برائی کا پیش خیمہ بن جائے، گھر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ جائز طریقہ پر اس کو اپنے حبالہ عقد میں لائے تھے مگر حضرت عمرؓ کی دور بین نگاہیں اس پہلو پر تھیں کہ عام لوگوں کی نظر طریقہ عمل کی صحت وعدم صحت پر کم ہوتی ہے وہ صرف طریقہ عمل کے نتیجہ کو دیکھتے ہیں اور اسی کو اپنے لیے بناتے ہیں، اس لیے وہ جب ان کی طرف متوجہ ہوں گے۔

جس کے امکانات بہت تھے تو پھر نیک وبد کی تمیز کے بغیر وہ ان سے تعلقات قائم کریں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اسلامی معاشرہ جس کی نشوونما وہاں ابھی شروع ہوئی ہے، وہ بالکل تباہ وبرباد ہو جائیگا اور وہ لوگ جو ابھی سیاسی حیثیت سے مغلوب ہوئے تھے اس طرح ان کے دوبارہ غالب آجانے کے امکانات بھی پیدا ہو جائیں گے۔ ان مصالح کو سامنے رکھ کر حضرت عمرؓ کے اس حکم پر غور کیا جائے تو وہ بالکل قرآن کے منشا کے مطابق معلوم ہوتا ہے۔ قرآن نے کتابی عورتوں سے نکاح کی اجازت دیتے ہوئے احصان، پاک دامنی، غیر مسافحین، کھلی ہوئی بدچلنی، چھپی ہوئی بدچلنی ولا متخذی اخدان کی قیدیں لگائی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں اس بات کا امکان ہوگا کہ ان قیدوں کی پابندی نہیں ہو سکے گی، وہاں اس کی اجازت نہیں دی جائے گی، تو حضرت عمرؓ کا یہ لکھنا کہ ''تم بدچلن عورتوں پر نہ جا پڑو، کیا بالکل منشائے قرآنی کے مطابق نہ تھا۔ غرض یہ کہ بہت سے دینی وسیاسی مصالح کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے یہ مخصوص حکم دیا تھا جس کا بحیثیت امیران کو حق تھا، اس کا تعلق کتابیہ کے نکاح کی منسوخی سے قطعی نہیں تھا۔ اگر واقعی انہوں نے یہ حکم نافذ ہی کر دیا ہوتا تو نہ تو حضرت حذیفہؓ سوال وجواب کی جرات کر سکتے تھے اور نہ حضرت عثمانؓ اور حضرت طلحہؓ وغیرہ اہل کتاب عورتوں کو اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حبالۂ عقد میں رکھ سکتے تھے، مگران دونوں بزرگوں نے آخروقت تک ان کو اپنے نکاح میں رکھااور حضرت عمرؓ نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا۔خود حضرت حذیفہؓ کے بارے میں یہ مذکور نہیں ہے کہ انہوں نے طلاق بھی دے دی، اسلیے کہ دوسرے خط میں حضرت عمرؓ نے صرف یہ لکھا ہے کہ یہ حرام تو نہیں ہے، مگر یہ تحلیل کسی حرام کے ارتکاب کا سبب نہ جائے غور فرمائیے، واقعات کی کیا صورت تھی اوران حضرات نے اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے ان کو کیا صورت دے دی، کاش یہ حضرات خلفائے راشدین کے فیصلوں کو کتاب وسنت کے خلاف ثابت کرنے سے پہلے ان کے مالہ وماعلیہ پر غور کر لیتے اور خود کتاب وسنت کے منشا کو سمجھ لیتے تو اس طرح کی باتیں لکھنے میں ان کا قلم اتنا بے باک نہ ہو جاتا۔

تجارتی گھوڑوں کی زکوٰۃ:

اس مسئلہ کے سلسلہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں اونٹ، بکری اور دوسرے حلال جانوروں کے پالنے والوں سے ان کی زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی لیکن گھوڑوں کے پالنے پر کوئی زکوٰۃ نہیں لی جاتی تھی، بلکہ آپ کے اس ایک ارشاد سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حکماً اس سے منع فرمادیا ہے لیکن حضرت عمرؓ نے اس اُسوۂ اور ارشاد نبوی کے باوجود اپنے اجتہاد سے گھوڑوں پر ایک دینار سالانہ کے حساب سے زکوٰۃ عائد کی۔اس مسئلہ کی تفصیل سے پہلے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ جزیرۂ عرب میں گھوڑوں کے پالنے کا رواج بھی تھا اور یہ بڑی عزت کی چیز بھی سمجھی جاتی تھی لیکن یہ صرف جنگی ضرورتوں یا سفر کی سہولت کے لیے پالے جاتے تھے۔اونٹ، بکری اور دوسرے جانوروں کی طرح افزائش نسل، تجارت یا زینت اور غذائی ضرورتوں کے لیے ان کے پالے جانے کا رواج نہیں تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی اونٹ یا بکری وغیرہ کے پالنے میں ان کو نگرانی کے علاوہ اور کوئی خاص زحمت اٹھانی نہیں پڑتی تھی۔نہ تو ان کے چارہ کے لیے کوئی اہتمام کرنا پڑتا تھا اور نہ رہائش کے لیے مکان فراہم کرنے کی ضرورتوں تھی۔ بلکہ ''وادی غیر ذی زرع'' کے کھلے ہوئے میدان ان کے لیے چارہ اور رہائش گاہ دونوں کا کام دیتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ عربوں کی عام آبادی نہ تو ان جانوروں کے پالنے میں کوئی وقت محسوس کرتی تھی اور نہ ان کی خرید وفروخت میں، برخلاف اس کے گھوڑوں کے خریدنے میں ایک بڑی رقم کی بھی ضرورت ہوتی تھی اوران کیلئے اچھی غذا اور رہائش کیلئے مکان کی بھی ضرورت ظاہر ہے کہ جزیرہ عرب کی تمام انسانی آبادی خود ان نعمتوں سے محروم تھی، وہ گھوڑوں کیلئے کہاں سے یہ چیزیں فراہم کرسکتی تھی جبکہ ان کے ذریعہ ان کی کوئی بنیادی ضرورت بھی پوری نہیں ہوتی تھی اس لیے گھوڑوں کے پالنے کا رواج وہاں صرف خوشحال طبقہ ہی میں تھا جو پوری آبادی کا بمشکل سواں حصہ تھا گو عربی نسل کے گھوڑے پوری دنیا میں مشہور تھے مگر یہ عربوں کے مقابلے میں ایرانیوں اور رومیوں کے پاس زیادہ پائے جاتے تھے۔(چنانچہ عربی نسل کے گھوڑوں کے علاوہ بھی بعض اچھی نسل کے گھوڑے ایرانیوں کے پاس ہوتے تھے جن کو وہ برزوان کہا کرتے تھے،بعض لوگ اس کو ایرانی نژاد کہتے ہیں اور بعض ترکی نژاد۔بعض حیثیتوں سے ان کو عربی گھوڑوں پر بھی ترجیح دی جاتی تھی)۔

کیونکہ وہ عربوں کے مقابلے میں زیادہ خوشحال بھی تھے اور زرخیز علاقہ ہونے کی وجہ سے انکی پرورش اور غور وپرداخت کا سامان بھی ان کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہر طرف فراوانی سے مل جاتا تھا، چنانچہ مسلمانوں سے ان کی جتنی لڑائیاں ہوئیں ان میں دوسرے اسلحوں کے ساتھ کھوڑوں کی بھی ریل پیل ہوتی تھی، وہاں گھوڑے صرف جنگی ضرورتوں ہی کے لئے ہیں بلکہ افزائش نسل اور تجارت کی غرض سے بھی پالے جاتے تھے چنانچہ حضرت فاروقؓ کے زمانہ میں جب یہ علاقے مکمل طور پر فتح ہوئے تو ایک نیا مسئلہ ان کے سامنے آیا کہ جس طرح اونٹ بکری اور دوسرے سائمہ (ازاد چرتے والے) جانور جب تجارت یا نسل بڑھانے کے لیے پالے جاتے ہیں تو ان کی زکوٰۃ لی جاتی ہے تو گھوڑے جو ان ہی مقاصد کے تحت ان علاقوں میں پالے جاتے ہیں تو ان کی زکوٰۃ بھی لی جائے یا نہیں، چنانچہ حضرت عمرؓ نے صحابہ کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کیا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کے مالکوں سے زکوٰۃ واجبہ تو نہیں لی جاسکتی لیکن بطور صدقہ ایک دینار یا دس درہم سالانہ فی راس وصول کی جائے۔ یہ فیصلہ ان حضرات نے اس لیے کیا کہ جن وجوہ کی بنا پر دوسرے جانوروں پر زکوٰۃ عائد کی گئی تھی قریب قریب وہ تمام وجوہ یہاں بھی پائے جاتے ہیں اس لیے ان پر بھی بطور صدقہ ایک رقم لگادی گئی لیکن اس کو زکوٰۃ واجبہ اس لیے قرار نہیں دیا گیا کہ عہد نبوی میں اس کی نہ تو کوئی مثال موجود تھی اور نہ صراحتہً آپ نے ان کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم دیا تھا۔

غرض یہ کہ عہد نبوی ﷺ میں گھوڑوں پر زکوٰۃ عائد کرنے کا کوئی سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوا۔ اس لیے ان کے بارے میں آپ نے صراحتہً کوئی حکم صادر نہیں فرمایا تھا اس کی ممانعت ثابت اور جب یہ سوال پیدا ہوا تو چونکہ آپ کے کسی ارشاد سے صرحتہً اس کی ممالغت ثابت نہیں تھی بلکہ بعض ارشادات سے ارشاۃً یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کی گنجائش ہے اور قیاسا بھی ان پر صدقہ عائد کرنے کی گنجائش نکلتی اس لیے ایسا کیا گیا، اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو پھر اس ارشاد نبوی کا کیا مطلب ہوگا جس میں آپ نے صراحتہً فرمایا ہے:۔

"لیس علی المسلم فی عبدہ ولا فی فرسہ صدقہ"

نہ تو مسلمان غلام پر صدقہ ہے اور نہ اس کے گھوڑے پر۔

یہ ارشاد نبوی ان غلاموں اور گھوڑوں سے متعلق ہے جو آدمی اپنی ذاتی سواری یا خدمت کے لیے رکھتا ہے چنانچہ غلام یعنی خدمت گار کے ساتھ ہی اس کا تذکرہ کیا گیا ہے اگر آپ ﷺ کو گھوڑوں کی زکوٰۃ سے صراحتہً روکنا ہوتا تو آپؐ فی فرسہ یعنی (ہ) کی ضمیر کے بجائے مطلق لفظ ولا فی فرس ارشاد فرماتے۔ پھر یہ ارشاد اس لیے بھی اس معنی پر محمول کیا جائے گا کہ آپؐ کے عہد میں جن مسلمانوں کے پاس گھوڑے تھے وہ محض ذاتی استعمال ہی کے لیے تھے اس کے برخلاف دوسرے ارشادات نبوی سے صراحتہً تو نہیں مگر ارشاۃً یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر یہ تجارت یا نسل بڑھانے کی غرض سے رکھے جائیں تو ان کا صدقہ لیا جاسکتا ہے، آپؐ نے ایک بار فرمایا کہ گھوڑوں کے پالنے کا نتیجہ تین طرح سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک آدمی کے لیے تو ان کا پالنا اجر وثواب کا سبب ہوتا ہے، دوسرے کے لیے عذاب وعتاب کا سبب ہوتے ہیں اور تیسرے کی عزت وآبرو کی پردہ پوشی ان سے ہوتی ہے یعنی وہ شخص جو کسی دینی مقصد یعنی جہاد وغیرہ کے لیے نہیں پالتا ہے، صرف اپنی نہ زینت وعزت افزائی کے لیے پالتا ہے، ایسے شخص کو گھوڑا پالنے کی اجازت تو ہے لیکن جب وہ: "لم ینس حق اللہ فی رقابھا ولا فی ظھورھا" (معانی الآثار، ج ا ص ۳۱۱)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ترجمہ:۔خدا کا وہ حق جوان کی گردنوں اور پیٹھوں سے متعلق ہے، نہ بھولے۔

(اس حدیث پر کلام کیا گیا ہے مگر حضرت عمرؓ کا عمل اور صحابہ کا اس سے اختلاف ثابت نہ ہوتا اس روایت کے ضعف کو دور کر دیتا ہے اس لئے کہ محدثین کا اصول ہے کہ تلقی بالقبول سے حدیث ضعیف بھی صحیح مان لی جاتی ہے)۔(تدریب الرادی ج ۱، ۶۷)

معلوم یہ ہوا کہ جو گھوڑے خدا کے دین کی خدمت ہی کے لیے پالے جائیں تو ان کا پالنا سراسر اجر وثواب ہے اور جو اس کے مقصد کے خلاف پالے جائیں وہ سراسر عذاب وعتاب کا سبب ہیں لیکن جو نہ تو کسی خالص دینی مقصد کے لیے پالے جائیں اور نہ غیر دینی مقصد کے لیے بلکہ صرف مادی زینت وآرائش یا مادی فائدہ کے لئے پالے جائیں تو وہ ان کے لئے پردہ پوش اس وقت ہو سکتے ہیں جب ان کی گردن اور پیٹھ کا حق ادا کر دیا جائے پیٹھ کا حق تو ظاہر ہے کہ اس پر سوار ہو کر جہاد کیا جاتا جائے اور گردن کا حق اس کے سوا اور کیا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے اوپر صدقہ جاری کیا جائے۔کوئی مالی یا غیر مادی ذمہ داری ڈالنے کے موقع پر'' رقبہ'' یا رقاب'' کا لفظ کتاب وسنت میں عموماً استعمال کیا جاتا ہے۔اوپر اس مسئلہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس سے یہ بات غالب واضح ہوگئی کہ حضرت عمرؓ نے نہ تو عہد نبوی اور صدیقی کے تعامل کے خلاف کوئی فیصلہ کیا اور نہ ارشاد نبوی کے خلاف، بلکہ ان کا فیصلہ بالکل ایک نئی صورت سے متعلق تھا اگر کوئی یہ ثابت کر دے کہ عہد نبوی میں تجارت اور افزائش نسل کیلئے گھوڑے پالے جاتے رہے ہوں اور پھر بھی آپ نے ان کی زکوٰۃ نہ لی ہو، یا اس سے صراحۃً منع فرمایا ہو تو البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عہد نبوی اور عہد صدیقی کے تعامل کے خلاف کوئی فیصلہ کیا، لیکن جب یہ بات ثابت نہیں تو اس کو خلاف سنت نبوی کہنا کم سوادی اور علمی کم مائیگی کے علاوہ اور کیا ہے۔یہ اور بات ہے کہ حضرت عمرؓ کے استدلال کو قیاسی طور پر قابل ترجیح قرار نہ دے کر اس کو واجب نہ قرار دیا جائے لیکن خلاف سنت کہنا انتہائی جرأت کی بات ہے۔اب مختصراً وہ تفصیل بھی ملاحظہ کر لیجئے جو گھوڑوں پر صدقہ مقرر کرنے سے متعلق حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے۔حارثہ بن مضرب بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کے ساتھ حج میں شریک تھا آپ کی خدمت میں شام کے کچھ معززین آئے اور عرض کیا کہ اے امیر المومنین! ہمارے پاس بہت سے گھوڑے، دوسرے جانور اور غلام وغیرہ ہیں، ان کا صدقہ لے کر ہم کو پاک کر دیجئے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے نبی ﷺ اور صدیقؓ نے تو گھوڑے اور غلام پر کوئی صدقہ نہیں لیا مگر تم ذرا ٹھہرو میں اہل رائے مسلمانوں سے مشورہ کر لوں۔چنانچہ آپ نے ممتاز صحابہ کرام سے مشورہ کیا تو صدقہ وصول کرنیکی رائے دی، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اب تک خاموش تھے۔حضرت عمر نے ان کی رائے معلوم کی تو انہوں نے بھی عام صحابہ کی رائے کی تائید کی مگر اس میں شرط لگا دی کہ:

"ان لکم یکن امرا و اجباولا جزیۃ راتبۃ یوخذون بھا. (معانی الثانی ج ا ص ۳۱۱ مسند احمد بحوالہ المنتقی ج ۲ ص ۱۲۹)

ترجمہ:۔'' یہ نہ فرض قرار دیا جائے اور نہ اس کو مقررہ ٹیکس سمجھا جائے کہ لامحالہ ان سے وصول ہی کیا جائے''۔

چنانچہ اس کے بعد عمدہ گھوڑوں پر دس درہم سالانہ اور ہجین یعنی معمولی گھوڑوں پر آٹھ اور برزون وغیرہ پر پانچ درہم سالانہ زکوۃ مقرر کی گئی۔اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد امام طحاوی لکھتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت عمر نے گھوڑوں پر جو صدقہ عاید کیا تھا وہ زکوٰۃ واجبہ کے علاوہ ایک صدقہ تھا۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے اس طرف اشارہ بھی کر دیا تھا کہ یہ ان پر فرض عائد نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی بطور واجب وفرض تو اس زکوٰۃ اسی وقت قرار دیا جا سکتا تھا جب تک کتاب یا سنت یا دونوں سے صراحتہً ثابت ہوتا۔ ان تمام تفصیلات سے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ بالکل ہی نئی صورت تھی جس میں صدقہ عائد کیا گیا اور اسی پر کیا اگر کسی ملک میں کوئی بالکل نیا حلال جانور تجارت اور افزائش نسل کیلئے پالا جانے لگے تو اس پر بھی زکوٰۃ لی جائیگی لیکن چونکہ اس بارے میں کوئی اسوۂ نبیؐ یا ارشاد نبوی موجود نہیں تھا اس لئے حضرت عمرؓ نے صحابہ کے مشورہ سے احتیاطاً اس کو زکوٰۃ واجبہ قرار نہیں دیا۔

صدقاتِ واجبہ کی تفصیل: (زکوٰۃ واجبہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی اور نہ دینے والوں کے خلاف جنگ کی جا سکتی ہے، جیسا کہ مانعین زکوٰۃ کے سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ نے کیا تھا۔)

بلکہ بطور صدقہ یا بطور ٹیکس کچھ رقم ان پر عائد کی۔ اگر چہ ایسے گھوڑوں پر زکوٰۃ واجبہ قرار دی جاتی تو یہ بھی کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ کے منشا کے خلاف نہ ہوتا کیونکہ تجارتی اموال اور تمام سائمہ جانوروں پر زکوٰۃ کا وجود بھی ثابت ہوتا ہے مگر اس کے باوجود عمرؓ نے انتہائی محتاط صورت اختیار فرمائی۔ پھر بھی یہ کہنا کتنی جرأت کی بات ہے کہ آپ نے سنت نبوی کے خلاف کوئی فیصلہ کیا۔

امہات الاولاد کی خرید وفروخت:

وہ لونڈیاں جن کے بچے ہو جاتے ہیں ان کو ام ولد کہتے ہیں' اس ام ولد کی جمع "**امہات الاولاد**" ہے۔ اس بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ عہد نبوی میں ان کی خرید وفروخت کی اجازت تھی لیکن حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے مشورے سے ان کی خرید وفروخت موقوف کر دی اور ان کو آزاد عورتوں کا مرتبہ دے دیا۔

اسی سلسلہ میں اگر ان احکام ہی کو سامنے رکھا جائے جو کتاب وسنت میں غلاموں کی آزادی، ان کی عزت افزائی اور معاشرہ میں ان کو آزاد انسانوں کے مساوی مرتبہ عطا کرنے کے سلسلہ میں دیئے گئے ہیں تو بھی حضرت عمرؓ کا یہ طرز عمل کتاب وسنت کے منشا کے خلاف نہ نظر آئے گا۔ لیکن ان احکام کے علاوہ دوسرے قوی نقلی دلائل بھی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کوئی نیا فیصلہ نہیں کیا بلکہ ایک حکم شرعی یا منشائے نبوی کو قانوناً نافذ کر دیا۔ اسی نفاذ کی وجہ سے محدثین ومورخین اس کو اولیات عمر میں داخل کرتے ہیں۔ اسی مسئلہ کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

غالباً ۶ھ میں مقوقس شاہ مصر نے نبی کی خدمت میں دو کنیزیں بھیجی تھیں جن میں ایک کا نام حضرت ماریہ قبطیہ تھا جن کو نبی ﷺ نے اپنی خدمت میں رکھ لیا۔ ان ہی کے بطن سے نبی ﷺ کے صاحبزادے ابراہیم پیدا ہوئے تھے ان کے پیدائش کے بعد ایک بار صحابہ کے سامنے حضرت ماریہ کا ذکر آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اب وہ لونڈی نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت آزاد عورت کی ہے۔

"اعتقها ولدها" ان کے بچے نے انہیں آزاد کر دیا۔ (**ابن ماجه دار قطنی المنتقی ج ۲ ۴۹۰**).

چنانچہ تمام ازواج کی طرح وہ بھی پردہ میں رہتی تھیں اور ان کا نان نفقہ آپ ﷺ ہی برداشت فرماتے تھے۔ اس ارشاد نبوی سے واضح طور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر معلوم ہوا کہ اگر کسی لونڈی کو اس کے آقا کے صلب سے کوئی بچہ پیدا ہو جائے تو اس کی حیثیت لونڈی اور کنیز کی نہیں رہتی بلکہ ایک آزاد عورت کی ہو جاتی ہے۔ اب اس پر بھی وہ تمام احکام جاری ہوں گے اور اس کو وہ تمام حقوق ملیں گے جو ایک آزاد عورت پر جاری ہوتے ہیں اور اس کو ملتے ہیں۔ ان ہی احکام اور حقوق میں ایک حکم اور حق یہ بھی ہے کہ جس طرح ایک آزاد عورت بیچا اور خریدا نہیں جاسکتا اسی طرح اس کی بیع وشرا بھی نہیں کی جاسکتی۔ آپ ﷺ نے ایک دوسرے ارشاد میں فرمایا ہے کہ بچوں کو ان کے ماؤں سے علیحدہ نہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان کی خرید وفروخت ہوگی تو لامحالہ ماں اور اس کے بچّے کے درمیان تفریق ہوگی، کیونکہ خریدنے والا بھی ماں کے ساتھ بچّے کی پرورش کا بار اٹھانے میں تامل کرے گا اور بیچنے والا بھی اپنے اولاد کو بیچنے پر مشکل سے راضی ہوگا۔ ایسی صورت میں دونوں میں تفریق لازم آئے گی۔ اس سے بھی زیادہ واضح آپ کا وہ ارشاد ہے جس میں آپ نے صراحتہً ام ولد کی آزادی کا اعلان فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:۔

"ایما امة ولدت من سیدها فهی حرة اذا مات الاان یعتقها قبل موته"

ترجمہ:۔"جس لونڈی کو اس کے آقا کے صلب سے بچہ پیدا ہو جائے وہ اس کے مرنے کے بعد آزاد ہے اگر وہ اپنی زندگی ہی میں اسے آزاد کردے تو اسی وقت آزاد ہو جائے گی"۔

(اس روایت کو حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے انکے علاوہ ابویعلی اور امام احمد بن حنبل نے بھی اپنی اپنی مسندوں میں نقل کیا ہے۔ اس روایت میں بعض رواۃ کو ضعیف کہا گیا ہے لیکن چونکہ یہ روایت ایک ہی طریقہ سے نہیں بلکہ متعدد طرق دو واسطوں سے مروی ہے اس لئے اس کا ضعف دور ہو جاتا ہے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ آقا کی زندگی بھر وہ رہے گی تو اسی کے ساتھ، کیونکہ جو تعلق اس سے قائم ہو چکا ہے اس کے موت سے پہلے قطع کرنا تو مناسب نہیں ہے لیکن بہرحال اب نہ تو وہ اس کے ملکیت نکل کر کسی دوسرے ملکیت میں جاسکتی ہے اور نہ آقا اس کو دوسرے کی ملکیت میں دے سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب انتقال ملکیت ہی ممکن نہیں ہے تو پھر اس کو فروخت کیسے کیا جاسکتا ہے۔ ان ارشادات نبوی کو ذہن میں رکھ کر اب ایک نظر حضرت عمرؓ کے فیصلہ اور ان کے فرمودات پر ڈال لیجئے! آپ نے یہ حکم نافذ فرماتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"ایما ولیدة ولدت من سیدها فانه لا یبعها ولا یهبها ولا یورثها وهو یستمتع منها فاذامات فهی حرة"

ترجمہ:۔ جس لونڈی کو بھی اس کے آقا کے صلب اولاد ہو جائے اس کو اس کا آقا نہ وراثت میں اس کو کوئی تو نہ بیچ سکتا ہے اور نہ ہبہ کر سکتا ہے اور وراثت میں اس کو کوئی پا سکتا ہے وہ اس سے زندگی میں متمتع ہونے، مرنے کے بعد وہ آزاد سمجھی جائیگی"۔

کیا اوپر جو حدیث نبوی نقل کی گئی ہے اس میں اور حضرت عمرؓ کے اس حکم میں ذرہ برابر بھی کوئی فرق ہے۔ مشہور اور ممتاز تابعی حضرت سعید بن المسیبؒ بیان کرتے ہیں کہ اسی بنا پر جب حضرت فاروقؓ نے ان کو آزاد کرنے کا حکم دیا تو یہ بھی واضح کر دیا کہ میں اپنے جی سے ایسا حکم نہیں دے رہا ہوں بلکہ خود نبی ﷺ نے بھی انہیں آزاد قرار دے دیا ہے، ابن مسیّب کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''ان عمی اعتق امہات الاولاد وقال اعتقھن رسول ﷺ''۔

ترجمہ:۔''حضرت عمرؓ نے جب ان کی آزادی کا حکم دیا تو فرمایا کہ ان کو نبی ﷺ نے ہی آزاد کردیا''۔

یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ میں جمہور امت کا اجماعی فیصلہ ہے کہ امہات الاولاد کی خرید وفروخت ممنوع ہے۔ ائمہ اربعہ جو جمہور امت کی نمائندگی کرتے ہیں وہ بھی اس مسئلہ میں متفق الرائے ہیں، عہد صحابہ میں تو اس مسئلہ میں کچھ اختلاف رہا مگر تابعین کے زمانہ میں حضرت عمرؓ کے فیصلہ پر اجماع ہوگیا۔

''واتفقوا علی انہ لاتباع امہات الاولاد (انصاح ص ۲۴۶)''۔

ترجمہ:۔''ائمہ اربعہ متفق ہیں کہ امہات الاولاد کو فروخت نہیں کیا جاسکتا ہے''۔

شیخ ابن ہمام اپنی مشہور کتاب فتح القدیر میں لکھتے ہیں:۔

''ھذا مذھب جمھور الصحابة والتابعین والفقھاء الامن لایعتدبہ کبشیر المریسی وبعض الظاھر یہ والمعتزلیہ فقالو ایجوز بیعھا''۔

ترجمہ:۔''یہ مسلک تمام جمہور صحابہ، تابعین اور فقہاء کا ہے صرف چند نا قابل اعتنا آدمی ایسے ہیں جو اس کی فروخت کے قائل ہیں، مثلاً بشیر المریسی معتزل اور بعض ظاہری''۔

امت کے چند افراد جو ام ولد کی فروخت کے قائل ہیں ان کے استدلال کی بنیاد حضرت جابر بن عبداللہ کا یہ بیان ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں امہات الاولاد کو فروخت کردیا کرتے تھے، مگر حضرت عمرؓ نے اس سے روک دیا تو ہم رُک گئے۔ (ابوداؤد)۔

لیکن حضرت جابرؓ کے اس بیان سے یہ بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ نبی ﷺ نے اس کی اجازت دی ہو یا آپ کو اس کا علم ہوا ہو اور آپ نے منع نہ فرمایا ہو، یہ بات ضرور اہمیت رکھتی ہے کہ ایک صحابی عہد نبوی کا یہ تعامل بتارہے ہیں۔ لیکن دو وجہوں سے اس بیان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔ ایک یہ کہ اوپر آپ کے صریح ارشادات کے مقابلہ میں اس ایک بیان کو ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ دوسرے یہ کہ کسی صحابی کے بیان کی اہمیت اور اس کی شرعی حیثیت اس وقت ہوتی ہے جب اس کے ساتھ نبی ﷺ کی تقریر بھی ہو، یعنی اس واقعہ کا آپ کو علم ہوا اور آپؐ نے اسے پسند فرمایا ہو، یا اس پر خاموش رہے ہوں جب تک آپ کی تقریر نہ ہو اس وقت تک اس کا قوی امکان ہے کہ آپ کو اس واقعہ کا علم ہی نہ ہوا ہو۔ اور آپ جب تک آپؐ کو علم نہ ہوا ہو اس کی شرعی حیثیت کے بارے میں کوئی حکم لگایا جاسکتا ہے اور اس کا امکان اس لئے بھی زیادہ ہے کہ امہات الاولاد کی خرید وفرخت کا موقع شاذ ونادر ہی پیش آتا تھا یہ عام خرید وفرخت کی طرح روزمرہ کی چیز نہیں جتنی کہ روم وایران کے فتح ہونے کے بعد ہوئی امام خطابی معالم السنن میں جابر بن عبداللہؓ کے بیان کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

''یحتمل ان یکون ھذا لفعل منھم فی زمان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو لایشعر بذالک لانہ امریقع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نادراً ولیست امہات الاولاد"۔

اس بات کا قوی احتمال ہے۔ کہ عہد نبوی میں صحابہ نے ایسا کیا ہو اور آپ کو اس کا علم نہ ہوا ہو، اس لئے کہ ام ولد کی خرید وفروخت کا معاملہ شاذ و نادر ہی پیش آتا تھا اور اس لئے بھی کہ امہات کسائر الرقیق۔ (معالم السنن) الاولاد عام غلاموں کی طرح نہیں تھیں، اس مسئلہ کے ہر پہلو کو ناظرین کے سامنے رکھ دیا گیا ہے اب وہ خود ہی فیصلہ کریں کہ حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ کو خلاف سنت کہنا کسی طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ کیا ایسا کہنا اس مسئلہ سے انتہائی ناواقفیت کی دلیل نہیں ہے؟۔

ایک مجلس میں دی گئی تین طلاق کا مسئلہ:

یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہیں کہ جن کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں ایک مجلس میں دی گئی تین طلاق ایک شمار ہوتی تھی مگر حضرت عمرؓ نے تین طلاق قرار دیا، راقم الحروف نے تیس برس پہلے اس موضوع پر بھی ایک تفصیلی مضمون معارف میں لکھا تھا۔ جو اجتہاد و تبدیلی احکام کے سلسلہ میں شائع ہوا تھا۔ ادھر البحوث الاسلامیہ ریاض نے بھی اس موضوع پر ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا تھا، اس لئے پہلے ان کے فیصلہ کا خلاصہ ہم نقل کرتے ہیں۔ پھر اپنا اصل مضمون نقل کریں گے۔

البحوث الاسلامیہ کا آخری فیصلہ:

اس سلسلہ کی جملہ روایتوں اور فقہاء کے اقوال و آراء کے مالہ اور ماعلیہ پر غور وفکر کرنے کے بعد مجلس نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ لفظ واحد سے تین طلاق دینے سے ہی طلاق واقع گی"، مجلس نے جن وجوہات کی بناء پر یہ فیصلہ کیا ہے، مختصر طور پر ترجیح کے دلائل یہ ہیں۔

ا: پہلی دلیل یہ ہے:۔ کہ ارشاد ربانی ہے:۔"یا ایها النبی اذا طلقتم النساء فطلقوهن"

اس ایت کریمہ میں جس طلاق کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد وہ طلاق ہے جس کے بعد عدت گزارنے اور شوہر کے لئیر جوع کرنے یا چھوڑ دینے کا موقع باقی رہے۔ یہ بات رجعت سے پہلے عدت کے اندر تین طلاق دینے کے منافی ہے اس لئیکہ یہ طلاق، طلاق للعدۃ نہیں ہوگی۔ البتہ سیاقِ کلام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ طلاق بغیر العدۃ وقوع ہوسکتی ہے کیونکہ یہ طلاق اگر واقع نہ ہوگی تو طلاق بغیر العدۃ دینے والا ظلم کرنے والا نہیں ہوسکتا ہے اور نہ ہی اس کے اوپر سہولت کا وہ دروازہ بند ہوسکتا ہے جس کا ذکر آیت کریمہ:۔

"ومن يتق الله يجعل له مخرجا" میں کیا گیا ہے۔ اس مخرج سے مراد عبداللہ ابن عباسؓ کی تاویل کے مطابق رجعت ہے۔ آپ نے کسی ایسے شخص سے فرمایا جس نے تین طلاق دے رکھی تھی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔" ومن يتق الله يجعل له مخرجا" چونکہ تم خدا سے ڈرتے نہیں اس لئے مجھے تمہارے واسطے کوئی مخرج نظر نہیں آتی، تم نے اللہ کی نافرمانی کی اور تمہاری بیوی تم سے جدا ہوگئی۔ اس بات پر کوئی اختلاف نہیں کہ تین طلاق دینے پر اگر ایک ہی طلاق واقع ہوگی تو اس فتویٰ کا کیا مفہوم و مطلب ہوگا جس کے اختیار کرنے سے سہولت اور آسانی حاصل ہوتی اور وہ کیا سزا ہوسکتی ہے جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حدود اللہ کو پھاند جانے والے ظالم کو اس حیثیت سے دی جائے کہ اس نے بغیر عدت طلاق دے ڈالی؟ شریعت ایسے شخص کو جس نے اپ زبان سے کوئی غلط اور منکر بات نکالی اس غلطی کی سزا نہ دے تو پھر اس کو غلطی کی سزا مل ہی نہیں پائے گی جس طرح ظہار کرنے والے کفارہ کی صورت میں سزا دی جاتی ہے، اس سے ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر تین طلاق کو نافذ کر کے یہ سزا دی ہے اور اس نے اس کیلئے سہولت کا وہ راستہ جو تقویٰ اختیار کرنے کی صورت میں اس کیلئے کھولا گیا تھا، بند کر دیا "**ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا**" ا جب اس نے تقویٰ کا راستہ چھوڑ دیا تو اس نے خود اپنے اوپر ظلم کیا اور خدا تعالیٰ کی مقرر کردہ حد سے تجاوز کیا۔

۲: دوسری بات یہ کہ:۔ صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی۔ اس عورت نے دوسرے شخص سے نکاح کر لیا۔ جب اس نے بھی طلاق دے دی تو لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ اب یہ اپنے پہلے شو سے نکاح کر سکتی ہے؟۔

تو آپؐ نے فرمایا کہ:۔ "**لا حتی یذوق عسیلتھا کما ذاق الاول**"۔

امام بخاری نے اس حدیث کو "**باب من اجاز الطلاق ثلاثا**" کے تحت ذکر کیا ہے۔ اس حدیث سے استدلال پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ حدیث رفاعہ بنت وہب کے واقعہ کا اختصار ہے۔ ان کے بارے میں مسلم کی کئی روایتوں میں یہ ہے کہ ان کے دوسرے شوہر۔ ان کے تین طلاق علیحدہ دی تھی۔

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس اعتراض کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ تنہا واقعہ رفاعہ کی بات نہیں ہے بلکہ رفاعہ کے علاوہ ایک دوسری عورت کے ساتھ بھی یہی قصہ پیش آیا تھا، ایسے اور بھی متعدد واقعات ہوئے ہیں کیونکہ رفاعہ قرظی اور رفاعہ نضری دونوں ہی کے شوہر نے طلاق د تھی اور دونوں ہی سے عبدالرحمٰن بن زبیرؓ نے نکاح کر لیا تھا۔ لیکن ان دونوں کو مجامعت سے پہلے ہی طلاق دے دی۔ پھر آگے علامہ ابن حجر لکھتے ہیں کہ اس بناء پر ان لوگوں کا خیال بالکل غلط معلوم ہوتا ہے جو صرف ظن کی بنا پر رفاعہ بنت سموئل اور رفاعہ بنت وہب کو ایک قرار دیتے ہیں۔ جب اس حدیث کا موازنہ عبداللہؓ کی اس حدیث سے کریں گے جس کو طاؤس ان سے روایت کرتے ہیں:۔

"**کان الطلاق علیٰ عھد رسول ﷺ وابی بکر صدرنی خلافۃ عمر الثلاث واحدۃ امنح**"۔

(یعنی رسول ﷺ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دور میں تین طلاق سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی تھی) تو ان دونوں حدیثوں میں لفظ ثلاث سے یکبارگی ثلاثا مراد لینا پڑے گا یا علیحدہ علیحدہ۔ اگر یکبارگی مراد لیں گے تو حدیث عائشہ متفق علیہ ہے اس لئے اس کو مقدم رکھنا زیادہ اولیٰ ہے کیونکہ اس میں صراحت ہے کہ اس تین طلاق ہے اس حرام کر دیا۔ اب بغیر دوسرے سے نکاح و وطی کیے ہوئے حلال نہیں ہو سکتی۔ اگر علیحدہ علیحدہ مراد لیا جائے تو حدیث طاؤس میں لفظ ثلاث سے علیحدہ علیحدہ اور حدیث طاؤس میں یکبارگی مراد ہو سکتا ہے کہ نہیں؟ تو اس کے لئے بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳: تیسری بات یہ کہ:۔ بعض محققین مثلاً علامہ ابن قدامہ کی ترجیح کہ نکاح ایک ملکیت ہے جس کا متفرق طور پر جب خاتمہ صحیح ہے تو ایکبارگی بھی اس کا ازالہ درست ہوگا جیسا کہ تمام املاک میں ہوتا ہے۔ اسی طرح قرطبی لکھتے ہیں کہ جمہور علماء کی دلیل بالکل واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ جس عورت کو تین طلاق دے دی گئی ہو وہ طلاق دینے والے کیلئے اس وقت تک جائز نہیں ہوسکتی جب تک وہ دوسرے کے ساتھ نکاح نہ کرے اور لفظ طلاق ثلاث میں لغۃً اور شرعاً کچھ بھی فرق نہیں ہے جو ظاہر فرق محسوس ہو رہا ہے اس کو شارع علیہ السلام نے نکاح، عتق اور اقرار وغیرہ میں لغو قرار دے دیا ہے۔ چنانچہ اگر کسی نے اپنی باندی سے کہا کہ میں نے تمہارا ان تینوں سے نکاح کر دیا تو نکاح منعقد ہو جائے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ کہتا ہے کہ میں نے اس سے، اور اس سے تمہارا نکاح کر دیا، یہی حکم عتق اور اقرار وغیرہ کا بھی ہے۔

۴: چوتھی بات یہ کہ:۔ چند کے علاوہ اکثر علماء کا حضرت ابو ہریرہؓ کی اس حدیث: ”ان ثلاثا جدھن جد و ھزلھن جد“ (جو کہ امت کے نزدیک مقبول و معروف ہے) کی بناء پر اجماع ہے کہ ھازل کا طلاق واقع ہو جاتا ہے اس لئیکہ ہازل بالطلاق اس کے ذکر کی نیت اپنے دل میں کرتا ہے جیسا کہ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ ہازل دوقوع طلاق کے اسباب سلسلہ میں لکھتے ہیں: ”جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ طلاق میں لغو نہیں ہے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں بلکہ ان کے خلاف دلیل موجود ہے۔ اگر ہازل کی زبان سے بغیر ارادہ نیت طلاق کا لفظ نکل گیا تو متفقہ طور پر طلاق واقع نہیں ہوگی، لیکن جب اس نے بطور مذاق صرف اس لفظ کو قصداً ادا کیا ہو تو گویا اس کے دل نے اس کے ذکر کی نیت کی“، پس اگر ایک سے زائد پر اسے محمول کیا جائے تو یہ زیادتی مسمائے طلاق سے خارج نہ ہوگی بلکہ وہ بھی صریح طلاق ہی ہوگی اور اگر ثلاث سے ایک مراد لیں گے تو اسکے بعض عدد پر تو عمل ہوگا مگر بعض بغیر دلیل کے خارج ہو جائیں گے الا یہ کہ حدیث ابن عباسؓ کو بنیاد بنائیں اور حدیث ابن عباسؓ کا جواب آگے آ رہا ہے۔

۵: پانچویں بات یہ کہ:۔ لفظ ثلاث سے تین طلاق کا واقع ہونا اکثر علماء سے منقول ہے چنانچہ حضرت عمر، عثمان ابن عباس، ابن عمرؓ، ابن عمرا اور ابن مسعود وغیرہ تمام ہی اجلہء اصحاب رسول اللہ ﷺ کا یہی مسلک ہے اور ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل نیز ابن ابی لیلیٰ اور امام اوزاعی رحمھم اللہ کا بھی یہی مسلک ہے ابن عبدالہادی نے علامہ ابن رجب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: (جملہ صحابہؓ تابعین اور ائمہ سلف (جن کے فتاوے کا اعتبار ہے) میں سے کسی ایک سے بھی اس طرح کی کوئی صریح بات منقول نہیں ہے کہ دخول کے بعد لفظ ثلاث سے ایک ہی طلاق متصور ہوگی۔

”شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ اس سلسلہ کے اقوال پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: دوسرے یہ کہ، یہ طلاق، محرم اور لازم ہے۔ یہی امام مالک، امام ابوحنیفہؒ اور بعد کی روایت کے مطابق امام احمد کا بھی قول ہے، اکثر صحابہؓ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور بعد کے اکثر صحابہؓ اور تابعینؒ سے بھی یہی منقول ہے“۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علامہ ابن قیم کا بیان ہے کہ: اس میں اختلاف ہے یعنی لفظ واحد سے تین طلاق کے وقوع کے بارے میں چار مسلک ہیں ایک یہ کہ تین طلاق واقع ہوگی، یہی ائمہ اربعہ جمہور تابعینؒ اور اکثر صحابہ کا قول ہے۔

امام قرطبی کہتے ہیں کہ: ہمارے علماء کا بیان ہے کہ اور ائمہ مجتہدین کا اتفاق ہے کہ لفظ واحد سے تین طلاق کا وقوع لازمی ہے اور یہی جمہور سلفؒ کا قول ہے۔ علامہ ابن العربی نے اپنی کتاب الناسخ والمنسوخ میں لکھا ہے، جس کو علامہ ابن قیم نے اپنی کتاب تہذیب السنن میں نقل کیا ہے کہ ارشاد ربانی ہے الطلاق مرتان اسکے بارے میں اخیر زمانے میں ایک قوم بھٹک گئی اور وہ یہ سمجھتی ہے کہ لفظ ثلاث سے تین طلاق واقع نہیں ہوتی بلکہ وہ اسے ایک ہی مانتی ہے وہ اپنی بات کو سلف اول کی جانب منسوخ کرتی ہے۔

چنانچہ حضرت علی، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف، عبداللہ ابن مسعود اور ابن عباسؓ حجاج بن ارطاۃ کے واسطہ سے اسکی روایت کرتے ہیں جو کہ ایک فرضعیف اور غیر ثقہ راوی ہیں اس سلسلہ میں وہ لوگ ایسی حدیث بیان کرتے ہیں جن کی کوئی اصل نہیں، وہ یہاں لکھتے ہیں کہ وہ لوگ جن باتوں کو صحابہ کرامؓ کی جانب منسوب کرتے ہیں وہ سراسر جھوٹ اور بے بنیاد ہیں، جو نہ کسی کتاب میں مذکور ہیں اور نہ کسی صحابہؓ سے ایسی کوئی روایت منقول ہے وہ لکھتے ہیں کہ حجاج بن ارطاۃ کی حدیث کو امت نے رد کردیا ہے اور کسی امام نے اس کی تصدیق نہیں کی ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر مجلس نے یہ فیصلہ کیا کہ عبداللہ ابن عباسؓ اس حدیث پر کہ عہد نبوی دور صدیقی اور اوائل عہد فاروقی میں لفظ ثلاث سے ایک ہی طلاق واقع ہوئی تھی ایسے اعتراضات کیے گئے ہیں جن سے حدیث مذکورہ لائق ترک اور ناقابل احتجاج قرار پاتی ہے جمہور کا یہ واضح مسلک ہے کہ جب خبر واحد کے لئے متعدد طریق سے منقول ہونے کے بکثرت داعی موجود ہوں مگر اس کو فرد واحد ہی نقل کررہا ہے تو یہ اس کے عدم صحت کی دلیل ہے صاحب جمع الجوامع ان اخبار پر جن کی عدم صحت یقینی ہے، عطف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ ''والمنقول احاد افیماتو فر الدواعی الیٰ نقلہ خلافاً للرافضۃ''۔

(یعنی وہ حدیث بھی صحیح نہیں ہے جس کے لئے متعدد طریق سے منقول ہونے کے اسباب موجود ہوں مگر وہ طریق واحد ہی سے منقول ہے برخلاف روافض)۔

عبداللہ ابن عباسؓ کے تقویٰ، پرہیزگاری، ان کے علم، استقامت اور اظہار حق کی جرات کو دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ حضرت عمرؓ کے حکم کو بے چون و چرا تسلیم کرلیں گے جبکہ ان کو یہ معلوم ہو کر عہد نبوی، دور صدیقی اور اوائل خلافت عمر میں طلاق کا حکم ایک ہی تھا چنانچہ متعہ، حج، دینار کی بیع دینار سے، اور ام ولد کی بیع وغیرہ کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ سے انکا اختلاف ہر کسی کو معلوم ہے حضرت ابن عباسؓ کی جرات اظہار حق کا پتہ ان کے اس قول سے چلتا ہے جو انہوں نے حضرت عمرؓ کی مخالفت کرتے ہوئے حج تمتع کے بارے میں فرمایا تھا، وہ کہتے ہیں:۔ ''یوشک ان تنزل علیکم حجارۃ من السماء اقول قال رسول اللہ ﷺ وتقولون قال ابوبکرؓ وعمرؓ''۔

(یعنی قریب ہے کہ تم پر آسمان سے پتھر کی بارش نازل ہو، میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور تم لوگ کہتے ہو کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ نے کہا)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر بالفرض یہ تسلیم ہی کر لیا جائے کہ حدیث ابن عباسؓ صحیح ہے تو سوال یہ ہے کہ تمام اجلہ صحابہ کرامؓ باوجود اس کے کہ وہ تقویٰ وورع اور استقامت علی الحق کے بلند ترین مقام پر فائز تھے اور عہد نبوی، دور صدیقی اور اوائل خلافت عمرؓ میں ایک مسئلہ کے مکمل پیرو تھے آخر وہ کس طرح حضرت عمرؓ کے ایک ایسے حکم کو تسلیم کر سکتے تھے جو سرتاسر ان کے سابقہ علم وعمل کے خلاف تھا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی ہے کہ جملہ صحابہ کرامؓ میں سے کسی ایک صحابی سے بھی یہ ثابت نہیں ہے حضرت ابن عباسؓ کی اس رائے کے مطابق فتویٰ دیا ہو بلکہ خود حضرت ابن عباسؓ سے اس کے خلاف فتویٰ صادر کرنا ثابت ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ حدیث صحیح نہیں ہے اگر صحیح مان بھی لی جائے تو اس کا مفہوم کچھ اور لینا ہوگا، مثلاً کسی نے مختلف الفاظ سے طلاق دی تو وہ ایک ہی سمجھی جائے گی۔

طلاق ثلاثہ:۔

جن مسائل کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ عہد نبوی کے بعد ان کوئی خلفائے راشدین نے تبدیلی کی۔ ان میں ایک طلاق ثلاثہ کا مسئلہ بھی ہے یعنی اگر شخص ایک ہی نشست میں تین طلاقیں خواہ عدد کی تصریح کیساتھ، جیسے میں نے تین طلاق دی۔ کہدے یا الفاظ کی تکرار کے ساتھ یعنی تین طلاق بار طلاق دی، طلاق دی کہہ دے، تو عہد نبوی میں ایسی تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جاتا تھا مگر حضرت عمرؓ نے اس میں تبدیلی کر دی کہ ان کو ایک کے بجائے تین قرار دیا، اور چونکہ اسی پر امت کا تعامل ہے، اس لئے اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ حکومت وقت یا مرکز ملت کو اسلامی مسائل میں ہر طرح کی تبدیلی کا حق حاصل ہے۔ موجودہ دور میں جو لوگ اپنے کو اسلامی احکام میں تبدیلی کا حق دار سمجھتے ہیں انکی اصل ذہنیت تو یہی ہے کہ اسلامی مسائل میں ان کو ان کی خواہش کے مطابق کانٹ چھانٹ اور کتر بیونت کرنے کا پورا حق حاصل رہے چنانچہ خلفائے راشدین کی اولیات سے لے کر متاخرین علماء کی کسی اجتہادی رائے میں اگر تبدیلی احکام کی کوئی صورت بھی نظر آجاتی ہے تو اسے وہ اپنے لئے دلیل بنانے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ اسلامی قانون کے تاریخ تسلسل سے ان رشتہ منقطع بھی نہ ہونے پائے اور ان کی رائے وزنی بھی معلوم ہو، مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے جب کوئی صالح تبدیلی ان کی کسی خواہش کے خلاف پڑتی ہے تو اتباع سنت کا وعظ کہتے لگتے ہیں اور پوری امت کے تعامل کو بدعت قرار دیتے ہیں چنانچہ پاکستان حکومت نے جو عائلی کمیشن ۱۹۶۰ مقرر کیا تھا اس نے متعدد مسائل میں تو پہلی صورت اختیار کی۔ یعنی خلفائے راشدین کے مقابلے میں بعد کے کسی فقیہ یا موجودہ دور کے کسی مفکرؔ کے اجتہاد کو ترجیح دی، مگر طلاق ثلاثہ کے مسئلہ میں اس نے اتباع سنت کا لبادہ اوڑھ لیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کتاب وسنت کے اتباع کے پیش نظر ہم حضرت عمرؓ کی تبدیلی کو تسلیم نہیں کر سکتے اور ایک ساتھ گئی تین طلاقوں کو ایک قرار دینا چاہیے۔ ہمیں اس وقت کمیشن کی رپورٹ پر کچھ لکھنا نہیں ہے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اس وقت مسلمانوں کا حکمران طبقہ خواہ کسی اسلامی ملک کا ہو، الا ماشاءاللہ وہ کسی وجہ سے اسلام سے اپنا تعلق منقطع تو نہیں کرنا چاہتا مگر چونکہ اسکی تعلیم وتربیت خالص مغربی طرز پر ہوئی ہے اس لئے اس کے سوچنے کا انداز خالص مغربی ہوتا ہے وہ یہ جرأت تو نہیں رکھتا کہ اسلامی قانون کے مقابلہ میں خواہ وہ معاشرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے متعلق ہو یا معیشت وسیاست سے، مغربی قانون کو کھلم کھلا ترجیح دے سکے۔ (بعث پارٹی کے افراد انکے ہمنوا اس وقت کھلم کھلا اسلام کے قانون کے فرسودہ قرار دینے لگے ہیں)۔

بلکہ وعظ و پند کی حد تک وہ اسلامی قانون کی فضیلت ماننے اور اس کے سامنے عظمت کے پھول نذر کرنے کے لئے بھی تیار رہتا ہے مگر اس کے آگے وہ کوئی عملی قدم بڑھانا نہیں چاہتا، جہاں اسے دونوں میں کوئی ٹکراؤ نظر آتا، یا اس کی خواہش اور منفعت پر کوئی ضرب پڑتی ہوئی دکھائی دی یا اس کو اس خیال نے ستایا کہ دنیا میں ہم رجعت پسند مشہور ہو جائیں گے تو خلافت راشدہ کے تعامل یا اولیات

(گو خلفائے راشدین کے تعامل یا ان کی اولیات سے انکا استدلال صحیح نہیں ہوتا مگر وہ اس کی آڑ لینے کی کوشش ضرور کرتے ہیں)۔

کو اور اس سے بھی نیچے اتر کر کسی ایک شخص کی رائے کو اپنے استدلال کی بنیاد بنا کر کتاب وسنت کے کھلے ہوئے احکام اور پوری امت کے تعامل کو نظر انداز کرنے میں ذرہ بھی وہ تامل نہیں کرتا، چنانچہ ایسے لوگ کبھی حضرت عمرؓ کی اولیات کو بہانے بناتے ہیں، کبھی شرح وقایہ کے کسی جزئیہ سے استدلال کرتے ہیں، کبھی علامہ شبلیؒ اور ڈاکٹر اقبالؒ کے اشعار سے استدلال کرتے ہیں اور ان کی رائے یا قرآن وسنت کے سلسلہ میں ان کی تشریحات (جن کا مفہوم وہ خود مقرر کرتے ہیں) کے مقابلہ میں پوری امت کے تعامل اور اس کی تشریحات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ چنانچہ طلاقِ ثلاثہ کے سلسلہ میں بھی ان کا رویہ یہی ہے، تفویض طلاق کے سلسلہ میں انہوں نے شرح وقایہ کے ایک جزئیہ کو اپنے استدلال کی بنیاد بنائی۔ مگر طلاق ثلاثہ کے سلسلہ میں حضورؐ کے واضح ارشادات، صحابہ کے تعامل اور ائمہ اربعہ کے اجماع سب کو نظر انداز کر کے امت کے دو چار علماء کی رائے کو انہوں نے ترجیح دینے کی کوشش کی ہے حالانکہ ائمہ اربعہ کا اجماع ہی ترجیح کے لئے کافی تھا۔ بہر نوع جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں ایک شمار ہوتی تھیں، انکا استدلال دو روایتوں پر ہے۔

پہلی روایت:

پہلی روایت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کے والد عبد یزید نے اپنی عورت ام رکانہ کو طلاق دے دی اور ایک دوسری عورت سے شادی کر لی، مگر دوسری بیوی سے نباہ نہ ہو سکا۔ یہ معاملہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا۔ آپؐ نے عبد یزید سے کہا کہ تم اپنی پہلی بیوی کو واپس بلا لو۔ انہوں نے کہا کہ میں نے تین طلاقیں دی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے اس کا علم ہے، تم رجوع کر لو۔

(یہ روایت ابوداؤد نے نقل کی ہے مگر یہی روایت دوسرے الفاظ میں بھی مروی ہے، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ علامہ خطابی نے لکھا ہے۔ **"فی اسناد هذا الحديث مقال لان ابن جريج انما رواه عن بعض بنی ابی رافع ولم يسمعه والمجهول لايقوم به الحجة"** (ج ۳ ص ۲۳۶)۔ اس روایت کی سند میں کلام کیا گیا ہے اس لئے کہ ابن جریج سے ابو رافع کے خاندان کے بعض افراد نے روایت کی ہے جس کا نام نہیں لیا ہے اس لئے یہ روایت قابل صحت نہیں ہے۔)

(دوسری روایت میں ابو رکانہ کے بجائے خود رکانہ کا واقعہ بیان ہوا ہے اور اس میں لفظ ثلاثہ (تین) کے بجائے البتہ (قطعی) کا لفظ ہے، بحث آگے آتی ہے۔)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری روایت:

دوسری روایت طاؤس سے مروی ہے کہ ایک شخص ابوصہبا حضرت ابن عباس سے بہت سوال کرتا تھا، اس نے ایک بار ابن عباس سے کہا کہ آپ کو تو اس کا علم ہوگا کہ عہد نبوی، عہد صدیقی اور ابتدائے عہدِ فاروقی میں تین طلاقیں ایک ہی سمجھی جاتی تھیں۔ آپ نے کہا ہاں ایسا ضرور تھا، مگر جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ اس معاملہ میں میں جلد بازی سے کام لینے لگے ہیں جس میں ان کو صبر وتحمل سے کام لینا چاہئے تھا تو انہوں نے حکم دیا:۔ ''اجیزوھن علیھم''

ترجمہ:۔''ان پر تین طلاقیں نافذ کردی جائیں''۔

ؒ(اس روایت کے الفاظ میں بڑا اختلاف ہے، بحث آگے آئے گی۔ ابوداؤد اور مسلم وغیرہ میں یہ روایت ان ہی الفاظ میں درج ہے)۔

ان روایات کی صحت وعام صحت اور ان کے مفہوم کے تعین پر محدثین نے جو بحثیں کی ہیں، ان کو ہم بعد میں پیش کریں گے، اس سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نفس مسئلہ کو قرآن، سنت اور آثار صحابہ اور امت کے عام تعامل کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی جائے، پہلی اور دوسری ہجری تک جب کہ ابھی طلاق اور رجعت کے احکام تفصیل سے نازل نہیں ہوئے تھے تو اس میں لوگ بڑی بے اعتدالی سے کام لینے لگے تھے۔ ایک آدمی جتنی طلاقیں چاہتا تھا دے دیتا تھا اور پھر جب عورت اس سے علیحٰدہ ہوکر کسی اور اپنا نباہ کرنا چاہتی تھی تو مرد رجوع کرلیا کرتا تھا اور اس طرح زندگی میں کتنی بار طلاق دیتا اور رجوع کرلیتا۔

(جاہلیت میں اس پر کوئی پابندی نہیں تھی اس لئیے وہ عادتیں اب تک جاری تھیں)۔

اس کو غصہ آیا، اس نے طلاق دے دی، غصہ فرو ہوا، رجوع کرلیا۔ چونکہ عورتوں کے لئے یہ صورت انتہائی تکلیف دہ تھی۔ حضور انورﷺ کی خدمت میں جب اس طرح کے معاملے پیش ہوتے تھے تو آپ اس کے جواب میں ہمیشہ توقف فرمایا کرتے تھے اس لئیکہ قرآن میں ابھی صراحۃً کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، چنانچہ جب ''الطلاق مرتان'' کی آیت نازل ہوئی تو آپؐ نے حکم دے دیا کہ ایک مرد زیادہ سے زیادہ تین طلاق دے سکتا ہے حضرتِ عائشہ کی زبان سے اس حکم کے نزول کی تفصیل سنیئے۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ:''طلاق کا حکم نازل ہونے سے پہلے ایک آدمی جتنی طلاقیں چاہتا تھا دے دیتا تھا اور پھر عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کرلیتا تھا، یہاں تک کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں نہ تجھ کو علیحٰدہ کروں گا اور نہ تجھ کو اپنے قریب ہی آنے دوں گا۔ ایسا ہی کرتا رہوں گا۔ یہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں آئی اور اس نے اپنی تکلیف بیان کی، حضرت عائشہؓ نے اس کا تذکرہ نبی کریمﷺ سے کیا۔ آپ اسے سن کر خاموش ہوگئے اور اس وقت کوئی جواب نہیں نہیں دیا اور اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی:۔

''الطلاق مرتان فامساک بمعروفِ اوتصریح باحسان''۔

طلاق دوبار ہے اس کے بعد یا تو بھلائی سے روک لینا چاہیئے یا پھر خوش اسلوبی سے چھوڑ دینا چاہیئے۔

(یہ روایت امام بیہقی نے سنن میں نقل کی ہے اس روایت کو مرسلاً امام بخاری نے بھی اپنی صحیح درج کیا ہے)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے بعد طلاق دینا اور رجوع کرنا کھیل نہیں رہا، بلکہ اب ایک آدمی ایک بار یا دو بار طلاق دے کر عدت کے بعد بیو کو اپنے پاس رکھنے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ آپ نے لوگوں کی پچھلی ذہنیت کو بدلنے کیلئے بار بار اس سلسلہ میں یہ ہدایت فرمائی کہ لوگ طلاق کو کھیل اور مذاق نہ بنائیں، بلکہ اس اجازت سے انتہائی مجبوری کی حالت میں ہی فائدہ اٹھائیں آپ نے بار بار فرمایا:۔

''ابغض الحلال الی اللہ الطلاق''

ترجمہ:۔ حلال چیزوں میں مبغوض ترین چیز خدا کے یہاں طلاق ہے۔ (یہ روایت ائمہ خمسہ صحابی بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کی ہے۔)

اپ نے نکاح وطلاق کے بارے میں کبھی مذاق بھی اجازت نہیں دی، یعنی اگر کوئی شخص مذاق سے طلاق دے دے تو وہ مذاق بھی سنجیدگی پر محمول کیا جائے گا۔ آپ نے فرمایا:۔ ''ثلاث جد ھن جد وھزلھن جد النکاح وطلاق ،والرجعۃ''.

تین چیزوں کی سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے اور مذاق بھی سنجیدگی ہے نکاح، طلاق، اور رجعت، آپ نے اس بارے میں یہ تاکید فرمائی کہ اگر کسی کو طلاق دینے کی ضرورت پیش آئے تو حالت حیض میں طلاق نہ دی جائے، بلکہ طہر یعنی پاکی کی حالت میں دی جائے۔ اور ایک ساتھ دی جائے، بلکہ ایک طلاق دے کر طلاق دینے والا ایک ماہ کا انتظار کرے، اگر اس درمیان میں اس کے تعلقات درست ہو گئے تو رجوع کر لے، ورنہ پھر دوسرے مہینے طلاق دے، اس طرح اس کو اچھی طرح غور کرنے اور نادم ہونے کا موقع ملے گا۔ لیکن اگر اس نے کے لفظ کا بے جا استعمال کیا، یعنی اس نے حالتِ حیض مین طلاق دے دی، یا ایک وقت میں تینوں طلاقیں دے ڈالیں تو گو اس طرح طلاق دینا کتاب وسنت کی وضاحت کے خلاف ہے، مگر اس غلطی کی وجہ سے آدمی کو اس کے بنیادی حق سے تو محروم نہیں جا سکتا تھا، البتہ اس کو اس بات پر سزا دی جا سکتی ہے کہ اس نے غور وفکر اور ندامت کے موقع کو ضائع کر دیا، یہی بات ہے جسے آپ نے اور صحابہ کرام نے اس طرح طلاق دینے والوں سے ہمیشہ فرمائی۔ مقصد یہ ہے کہ طلاق کے معاملہ کو ہر صورت میں سنجیدگی پر محمول کیا جائے گا، اس لئےجب اس نے تین طلاق اپنی زبان سے دی، تو اس کو نافذ ہی کیا جائے گا، لیکن چونکہ اپنے استعمال میں اس نے غلطی کی ہے اس لئے اس کو اس کے ساتھ گنہگار بھی قرار دیا جائے گا اور سزا بھی دی جا سکتی ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ کرتے تھے۔

(فتح الباری ج۹ص۳۱۵ موجودہ دور کی کسی بھی اسلامی ملک کی حکومت کو یہ حق آج بھی ہے کہ اس کے لئے کوئی سزا مقرر کر دے۔)

چنانچہ رسول ﷺ کے سامنے جب بھی اس طرح کے معاملات پیش آئے، اپؐ نے ایک طرف تین طلاقیں نافذ کر دیں اور دوسری طرف اس کو گنہگار اور کار بھی فرمایا۔ حضرت محمود ابن لبید سے مروی ہے کہ ایک شخص کے بارے میں آپ کو یہ اطلاع ملی کہ اس نے اپنی عورت کو تین طلاقیں ایک ساتھ دے دی ہیں، تو آپ غصہ میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ میری موجودگی میں کتاب اللہ سے کھیل کیا جا رہا ہے۔

اس میں یہ ذکر ہے کہ آپ نے ان طلاقوں نافذ کیا یا نہیں، مگر اس روایت کے الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ آپ نے اس کو اس کو ضرور نافذ فرمایا جس کی تائید دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے۔ ابوبکر ابن عربی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ولم یروہ النبی ﷺ بل امضاہ''.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ترجمہ:۔آپ نے اسے رد نہیں کیا یعنی رجوع کا حکم نہیں دیا بلکہ تینوں کو نافذ کر دیا: حضرت ابن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں ایک میں ایک طلاق دی اور پھر خود ہی آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا، تو آپ نے فرمایا:

"ماھکذامرک اللہ اخطات السنة".

ترجمہ:۔"خدا نے تمہیں اسطرح طلاق دینے کا حکم نہیں دیا ہے تم نے سنت کے خلاف کیا"۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ رجوع کرلو اور پھر طلاق دینا ہو تو دوسرے طہر میں طلاق دینا۔ابن عمرؓ نے آپ سے پھر دریافت کیا کہ اگر میں نے ایک ساتھ تین طلاقیں دے دی ہوتیں تو کیا اس کے بعد بھی میں رجوع کر سکتا تھا۔آپؐ نے فرمایا:۔

کانت تبین ذالک و کانت معصیة:

ترجمہ:۔"تم رجوع نہیں کر سکتے تھے اس کے بعد وہ تم سے بالکل جدا ہو جاتی اور تمہارے اوپر گناہ بھی ہوتا"۔

(طبرانی بیہقی وغیرہ نے اس روایت کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا مگر اس روایت کے ابتدائی حصہ کو دوسرے ائمہ حدیث بخاری، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ نے نقل نہیں کیا ہے۔)

جس طرح ایک ساتھ تین طلاق دینا مناسب نہیں ہے اسی طرح حیض کی حالت میں طلاق دینا بھی منع ہے، آنحضرت ﷺ کا ارشاد اوپر گذر چکا ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ خدا نے اس طرح طلاق دینے کا حکم نہیں دیا ہے:۔جس طرح پہلے شخص کے بارے میں آپ نے غصہ کا اظہار فرمایا اسی طرح اس کو بھی غلط کار کہا اور غصہ کا اظہار فرمایا۔

(دارقطنی میں ھیے ،فتغیظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم).

اس کے باوجود آپ نے اس طلاق کو رد نہیں فرمایا۔اس پر بعض لوگوں کو تعجب ہوا اور انہوں نے ابن عمرؓ سے دریافت کیا کہ آپ اس طلاق کو طلاق سمجھتے ہیں۔انہوں نے کہا خاموش رہو، میری غلطی اور رحماقت کی وجہ سے کیا یہ طلاق شمار نہ کی جائیگی۔

(بخاری کتاب الطلاق ،اصل میں الفاظ فان مجزا واتحق آئے ہیں اس کے دو معنی بیان کیے گئے ہیں ایک تو اوپر بیان کیا گیا ہے دوسرا مطلب یہ ہے کہ طلاق کے علاوہ بھی کوئی چارہ کار ہے اس وقت یہ جملہ انکار یہ ہوگا۔(فتح الباری))۔

اس روایت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر طلاق صحیح طریقہ پر نہ بھی دی جائے تو وہ طلاق پڑ جاتی ہے، البتہ اس غلطی کی وجہ سے اس فعل کو معصیت کہا جائے گا۔پھر اس روایت کے آخری الفاظ پر غور کیا جائے تو اس سے پہلی روایت کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

یعنی ابن عمر کے پوچھنے پر آپ نے فرمایا کہ اگر تم اس حالت میں تین طلاقیں دے دیتے تو تمہاری بی بی تم سے علیحدہ بھی کر دی جاتی اور تم گنہگار بھی ہوتے۔یعنی یکبارگی تین طلاق دینے کے بعد بیوی علیحدہ تو ہو ہی جائے گی مگر چونکہ یہ طریقہ غلط ہے اس لئے آپ اس پر غصہ کا اظہار فرمایا، اس کو خلاف سنت کہا اور معصیت بتایا، تا کہ لوگ آئندہ اپنے حق کا استعمال صحیح طور پر کریں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تیسری روایت ملاحظہ:۔

سہیل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص عویمر کو اپنی پر شبہ ہوا، انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس کسی غیر مرد کو دیکھے تو اس کو قتل کر دے یا کیا کرے۔ آپؐ نے فرمایا اس بارے میں خدا کا حکم نازل ہو چکا ہے۔ جاؤ اپنی بیوی کو لے آؤ۔ تو آپ ان دونوں کو لعان کا حکم دیا، انہوں نے لعان کیا۔ (لعان کا طریقہ سورہ نور میں مذکور ہے)۔

اس کے بعد عویمر نے آپؐ کی موجودگی میں تین طلاقیں دیں اور آپؐ ان کو نافذ کر دیا، یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ لعان میں تفریق کا حکم کے ذریعے ہوتی ہے اور یہ فرض آپ نے خود انجام دیا، مگر یہ لعان کی بنا پر نہیں، بلکہ تین طلاق کی بنا پر آپؐ نے کی۔ اس سلسلہ میں ایک روایت اور ملاحظہ ہو۔ عبادہؓ بن صامت سے مروی ہے کہ ان کے دادا نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دیں۔

(ابوداؤد اور نسائی میں انہی الفاظ کے ساتھ یہ روایت آئی ہے امام احمد کی روایت میں کذبت کے بجائے ظلمت کا لفظ ہے اور تین طلاق کے بجائے تین بار لفظ طلاق دہرانا ہے)۔

انہوں نے رسول ﷺ سے ذکر کیا، تو آپؐ نے فرمایا تمہارے دادا نے خدا کا خوف نہیں کیا۔ محض تین طلاقوں کا ان کو حق تھا، البتہ ۹۹۷ طلاقیں ظلم و زیادتی ہیں، خدا چاہے گا تو معاف کر دے اور اگر چاہے گا تو عذاب دے گا۔ اس روایت پر شوکانی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں ان کے باپ یا دادا کے طلاق کا ذکر ہے اور ان میں سے کسی نے اسلام کا زمانہ نہیں پایا، اس لئے یان کے بارے میں سوال کے کیا معنی، مگر یہی روایت عبادہؓ بن صامت سے دار قطنی اور مجمع الزوائد میں ان الفاظ کے ساتھ روایت ہوئی ہے کہ میرے بعض بزرگوں میں سے کسی نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق دی اور ان کے لڑکوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا:۔

"بانت منه بثلاث غير السنة".

ترجمہ:۔ "تین طلاق سے عورت اس سے جدا ہوگئی اگر چہ یہ سنت کے خلاف ہے"۔

(یہ روایت دار قطنی میں دو واسطوں سے مروی ہے دونوں میں ایک ایک راوی کو بعض محدثین نے ضعیف کہا ہے اور ان پر شیعیت کا الزام لگایا ہے مگر اس کے باوجود ابن معین اور ابوداؤد نے انہی کی روایت کو قبول کیا ہے۔ اس لئے یہ روایت ضعیف ہونے کے باوجود اپنے متن کے اعتبار سے رد کر دینے ہے۔)

گو دونوں روایتوں پر محدثین نے کلام کیا ہے لیکن اوپر کی احادیث کی روشنی میں اس کو دیکھا جائے تو یہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے۔ ایک اور روایت حضرت حسن سے مروی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں، بیوی کو اس کا بڑا رنج ہوا۔ اسکی اطلاع ان کو ہوئی تو ان کو بھی رنج ہوا اور انہوں نے کہا کہ اگر میں نے قطعی طلاق نہ دے دی ہوتی تو رجعت کر لیتا، مگر اب مجبوری ہے۔ اس لئے کہ میں نے رسول ﷺ سے سنا ہے کہ تین طلاقیں طہر میں دے یا تین مہینے میں دے یا ایک ساتھ تین طلاقیں دے تو وہ عورت حرام ہو جاتی ہے اب بغیر نکاح ثانی وہ میرے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح حفص بن عمرؓ اور عبدالرحمٰن بن عوف کے بارے میں بھی مذکور ہے کہ ان لوگوں نے ایک مجلس میں تین طلاقیں دیں اور نبی کریم ﷺ کو اطلاع ہوئی مگر آپؐ نے اسے ایک نہیں قرار دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(یہ دونوں رویتیں دار قطنی میں ہے ان کی صحت مین کوئی کلام نہیں ہے البتہ بعض روایتوں میں یہ ہے کہ حفص بن عمرؓ نے تین طلاقیں جدا جدا دی تھیں اور ابن عوفؓ نے ''البتہ'' کا لفظ استعمال کیا یعنی قطعی طلاق یا بالکل طلاق کا لفظ استعمال کیا۔)

ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حیض میں یا ایک مجلس میں یا ایک طہر میں دی گئی تین طلاقوں کے بارے میں ہمیشہ آپؐ نے مرد و عورت کے درمیان جدائی کا فیصلہ فرمایا: ان ارشادات نبوی کے بعد اب ممتاز صحابہ کے آثار وفت وی پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے: مدینہ میں ایک پر مذاق آدمی تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دے ڈالیں، یہ معاملہ حضرت عمرؓ نے اپنا کوڑا سنبھالا اور کہا کہ تمہارے لئے تین طلاقیں کافی ہیں۔ (سنن بیھقی جلد ۷، ص ۳۳۴). (ابن حزم جن کا مسلک اس کے خلاف ہے، انہوں نے بھی یہ رویت نقل کی ہے)۔

حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ ان کے سامنے ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دے دی ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''بانت منک بثلاث'' ترجمہ: ''تین ہی سے تمہاری عورت تم سے جدا ہوگئی''۔

حضرت علیؓ کے پاس بھی ایک ایسا ہی شخص آیا اور اس نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دے دی ہے انہوں نے کہا کہ تین ہی طلاق نے تمہارے اوپر بیوی کو حرام کر دیا، بقیہ طلاقوں کو دوسری بیویوں میں تقسیم کردو۔ (بیھقی جلد ۷، ص ۳۳۵)

حضرت علیؓ کے اس فتوے بارے میں ممتاز تابعی اعمش بیان کرتے ہیں کہ کوفہ مین ایک شخص سے میں نے سنا کہ وہ حضرت علیؓ کے بارے میں یہ بیان کرہے تھے کہ مین نے ان سے سنا ہے کہ جو ایک مجلس میں تین طلاق دے، وہ ایک شمار ہوگی، کوفہ مین یہ نیا فتویٰ تھا اس لئے جوق در جوق یہ روایت سننے کیلئے ان کے پاس آنے لگے۔ میں بھی ایک دن ان کے پاس پہنچا اور ان سے کہا کہ آپ نے کس طرح سنا ہے کہ حضرت علیؓ ایک ہی وقت میں دی گئی تین طلاقوں کو ایک ہی سمجھتے تھے، انہوں نے وہ روایت بیان کی، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو یہ روایت کیسے نے وہ تحریر پیش کی، امام اعمش کہتے کہ میں نے اس کو پڑھا تو اس میں یہ تحریر تھا:

''هذاماسمعت علی بن ابی طالبؓ یقول اذاطلق امراۃ ثلاثۃ '' فی مجلسِ واحد فقد بانت ولاتحل له حتیٰ تنکح زوجاً غیره''. (سنن بیھقی، ج ۷ ص ۳۳۹، ۳۴۰).

ترجمہ: ''یہ میں نے حضرت علیؓ سے سنا ہے کرماتے تھے کہ جب کوئی شخص ایک مجلس میں تین طلاق دے دے تو وہ عورت بائن ہوگی اور جب تک وہ حلالہ نہ کرے اس وقت تک وہ اس کیلئے حلال نہیں ہوسکتی''۔ امام اعمش کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ افسوس ہوتے یہ تو بالکل اس کے خلاف ہے جو آپ بیان کرر ہے ہیں انہوں نے کہا صحیح تو یہی ہے جو اس میں لکھا ہے مگر مجھے کچھ لوگوں نے یہ روایت اس طرح بیان کرنے پر آمادہ کیا۔ (اس روایت پر کوئی کلام نہیں کیا گیا ہے مگر اس میں دونوں پہلوؤں کا امکان ہے۔ یعنی حضرت علیؓ کی مخالفت کے ساتھ امام اعمش کو مطعون کرنا بھی مقصود ہے)۔ حضرت علیؓ کے فتاوے عام عام طور پر کوفہ میں معروف ومشہور تھے اس لئے لوگوں کو تعجب ہوا اور لوگ جوق در جوق یہ نئی روایت سننے کے لئے آنے لگے، امام اعمش نے ان لوگوں کا نام نہیں بتایا کہ کن لوگوں نے ان کو اس پر آمادہ کیا تھا۔ قیاس یہی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالفین نے ایسا کرایا ہوگا۔ (جاری ہے......)

© rasailojaraid.com